قرآن اور اقبال

بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر

اقبال اور قرآن اور اقبال اور اسلامی تعلیمات کے موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اور مزید کام کرنے کی لامحدود گنجائش ہے۔ تاہم وقت کی قلت اس موضوع کی وسعت کو سمیٹنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میرے پیشِ نظر قرآنی آیات کے حوالوں سے کلام اقبال کا مختصر سا جائزہ مقصود ہے تا کہ اس پیغام کی روح کو سمجھا جا سکے جیسے اس دانائے راز نے ہم تک پہنچانے کے لیے شاعری کا سہارا لیا۔ لہٰذا شعوری کوشش کر کے اس جائزے کو فقط چیدہ چیدہ قرآنی آیات تک محدود رکھا گیا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی نے مثنوی مولانا روم کی نسبت فرمایا ہے:

مثنویٔ　　مولویٔ　　معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

مثنوی رومی میں اسلامی تعلیمات کو عام فہم فارسی میں روز مرہ امثال کے ذریعے عوام تک پہنچایا گیا ہے۔ تاہم مثنوی رومی میں قرآنی آیات کا حرف بحرف فارسی ترجمہ غالباً موجود نہیں۔ اس کے برعکس حضرت علامہ کے فارسی اور اردو کلام میں جا بجا قرآنی آیات کا منظوم ترجمہ موجود ہے۔ جہاں تک مفہوم کا تعلق ہے تو کلام اقبال کا بیشتر حصہ قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے۔ قرآن کی تعلیمات کو شاعری کے ذریعے عام کرنے کا کام ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ برصغیر میں سورۃ فاتحہ کا منظوم ترجمہ شاید آپ نے بھی سنا ہوگا۔ جس کا پہلا شعر ہے۔

سزاوار ثنا اللہ کی ذات گرامی ہے
جو رب العالمین ہے جس کی رحمت بھی عوامی ہے

اسی طرح مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے بھی چیدہ چیدہ قرآنی آیات کا بہت خوبصورت منظوم ترجمہ کیا ہے اس ضمن میں مولانا ظفر علی خان کے دو اشعار تو زبان زد عام ہیں کہ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ شعر قرآن مجید کی سورہ رعد آیت نمبر ۱۱ کا بہترین ترجمہ ہے۔

آیت:

ترجمہ: خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت خود نہ بدلے۔

انہی کا دوسرا شعر ؎

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

سورۃ صف کی آیت نمبر ۸ اور سورۃ توبہ آیت نمبر ۳۲ کا ترجمہ ہے۔

یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں اور خدا اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا چاہے کافروں کو برا ہی لگے۔

چیدہ چیدہ آیات اور سورتوں کے تراجم تو جوش ملیح آبادی جیسے شاعر نے بھی کیے ہیں۔ بہت سے شعرا نے قرآن مجید کے منظوم تراجم بھی کیے ہیں۔ اس سلسلے میں شمس الدین شائق ایزدی کا منظوم ترجمہ ۱۹۲۱ء میں آغا شاعر دہلوی کا ۱۹۲۳ء میں، کیف بھوپالی کا ۱۹۳۸ء میں اور سیماب اکبر آبادی کا وحیٔ منظوم کے نام سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

منصور فخری نے بھی پورے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور حال ہی میں محسن بھوپالی نے بھی قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی تراجم ہو رہے ہیں جن میں اصغر علی کوثر اور عقیل روبی کا کام بھی منظر عام پر آ رہا ہے جو زیر تکمیل ہے۔ تاہم علامہ اقبال کی حیثیت اس حوالے سے منفرد ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کے منظوم ترجمے کی شعوری کوشش تو ہرگز نہیں کی لیکن ایسی آیات جن کا مسلمانانِ ہند کی عملی جدوجہد سے تعلق تھا انہیں ''حرفاً اور معناً'' شاعری کی زبان میں ادا کر دیا ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن کریم کی موجودگی میں آیات کے ترجمے کا محرک کیا تھا۔ آیا علامہ اقبال نے شعوری کوشش کر کے قرآنی آیات کا ترجمہ کیا ہے؟

کیا ان کے پیش نظر قرآن کا شعری ترجمہ تھا یا کہ یہ ترجمہ انسپریشن کا فطری نتیجہ تھا؟ حضرت علامہ کی زندگی کے معمولات اور قرآن کریم سے ان کے شغف کا علم رکھنے والے حضرات کی آراء بھی اس سلسلے میں منقسم ہو سکتی ہیں۔ دراصل اقبال کے پیش نظر زندگی کے ہر موڑ پر قرآنی تعلیمات تھیں۔ ۱۹۱۷ء میں رموز بے خودی کی تصنیف کے زمانے میں مولانا گرامی کے نام خط میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے مستقبل کے ضمن میں لکھا ہے کہ

> میری سمجھ اور علم کے مطابق ملت اسلامیہ کو پیش آمدہ تمام حالات قرآن شریف میں موجود ہیں۔ استدلال ایسا صاف اور واضح ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ میں نے پندرہ سال تک قرآن مجید پڑھا ہے اور بعض آیات و سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے

طویل عرصے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔!

یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے اور کوئی مسلمان بقائمی ہوش وحواس اس سلسلے میں کذب بیانی کی جسارت نہیں کر سکتا۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ واقعی علامہ اقبال کا قرآن کریم کا مطالعہ اتنا وسیع وعمیق تھا کہ وہ اس میں غوطہ زن ہو کر گوہر بے بہا برآمد کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور دانائے راز ہونے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعرانہ حیثیت کو خود بھی پسند نہیں فرمایا بلکہ محض قبول عام کے لیے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔

وہ شاعری کو اپنے لیے ایک تہمت گردانتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے متعدد بار شاعر کہے جانے پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا ہے فرماتے ہیں ؎

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثال شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

ترجمہ: یہ خیال نہ کرنا کہ میں بغیر پیے مست ہو گیا ہوں اور شاعروں کی طرح کہانیاں گھڑ رہا ہوں۔ جو کم مایہ شخص مجھ پر شعر وسخن کی تہمت لگائے اس سے خیر کی امید نہ رکھنا۔ مزید ارشاد ہوتا ہے ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

ترجمہ: کہاں نغمہ اور کہاں میں شعر تو محض بہانہ (ذریعہ) ہے میں تو قوم کی بے مہار اونٹنی کو کھینچ کر واپس قطار میں لے جا رہا ہوں۔ سید عابد علی عابد سے آرٹ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ''میرے کلام کو آرٹ سے کیا تعلق میری شاعری اسلامی تفکر کی تفسیر وتعبیر ہے''۔

ضرب کلیم میں فرماتے ہیں ؎

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں

اقبال ''فلسفی شاعر'' تھے یعنی ان کی بنیادی حیثیت ایک فلسفی کی تھی جن کے پاس ایک مخصوص پیغام تھا اور وہ پیغام عام کرنے کے لیے انہوں نے شاعری کو محض ذریعۂ اظہار بنایا۔ اقبال کے نزدیک نفس مضمون کی اہمیت حسن بیان سے بڑھ کر تھی اس سلسلے میں علامہ اقبال نے اپنی حتمی رائے کا اظہار یوں کیا ہے کہ:۔

> شاعری کی اصل حیثیت محض محاورات اور اظہار بیان کی درستگی سے ماورا ہے۔ میرا شاعری کا معیار نقادوں کے ادبی معیار سے قطعی مختلف ہے میرے کلام میں شاعری (حسن اظہار) نفس مضمون کے تابع ہے اور میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ میرا شمار عصر حاضر کے شعرا میں ہو۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے علامہ اقبال شاعری برائے شاعری یا ادب برائے ادب کے نظریے

کے سخت مخالف تھے اور صرف ''شاعری برائے حیات اقوام'' پر یقین رکھتے تھے۔

منطقی طور پر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے پاس وہ کونسا پیغام تھا جو انہیں ''شعرائے محض'' سے ممیّز کرتا ہے اور کس پیغام کو قبول عام بنانے کے لیے انہوں نے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ علامہ کے اپنے الفاظ میں ان کی شاعری اسلامی تفکر کی تفسیر و تعبیر ہے۔ قوم کی زبوں حالی، تنگدستی، پست ہمتی اور ذہنی دیوالیہ پن حضرت علامہ کے لیے سوہان روح تھا۔ متاع کارواں تو لٹ ہی چکا تھا لیکن اس سے بدتر بات یہ تھی کہ قوم کا احساسِ زیاں بھی مٹ چکا تھا۔

علامہ اقبال نے اپنے کلام سے نہ صرف قوم کو کچوکے دے کر زیاں کا احساس دلایا بلکہ تسلی و تشفی سے امید بھی بندھائی اور زخم پر مرہم بھی رکھا، عظمتِ رفتہ کے حوالے سے قوم کو اپنے عروج کا زمانہ یاد دلایا، زوال کے اسباب کا تجزیہ کیا اور قرآنی تعلیمات کی دعوت دے کر ایک تابناک مستقبل کی نوید سنائی۔ یہی پیغام ابدی ان کی شاعری کا مقصود عین تھا اس ضمن میں کلیات اقبال میں فرماتے ہیں ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

ترجمہ: اگر میرا دل جوہر آبدار نہیں بلکہ بے وقعت کانچ کا ٹکڑا ہے اور اگر میرے کلام میں قرآن کے علاوہ کچھ اور تحریر ہے تو اے خدا کے رسولؐ میرے افکار کی حرمت ختم کر دیجیے اور اس گلشن کو میرے وجود کے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔

ڈاکٹر اقبال نے اپنی زندگی کی راتیں سوز و ساز اور پیچ و تاب کی کشمکش میں گزاریں اور اس نتیجے پر پہنچے کہ صوفی و مُلا کی قرآنی تشریح سے مزید کٹھ ملا اور سجادہ نشین تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن گہرائی اور گیرائی کے فقدان اور جذبے کی کمی کی وجہ سے نہ تو قوم میں بیداری کی روح پھونکی جا سکتی ہے اور نہ ہی قرآنی تعلیمات کے حقیقی ثمرات سے بہرہ ور ہوا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس شارح قرآن مجید نے جدید زندگی کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اور بطور خاص ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے پیش نظر قرآن کی وہ تشریح کی جو کہ قوم کو اس حالت زار سے نجات دلا کر اوج ثریا تک پہنچا سکتی تھی۔

علامہ اقبال کے پیشِ نظر قرآن کا شعری ترجمہ ہرگز نہ تھا کیونکہ انہیں تو خود کو شاعر کہلوانا بھی گوارا نہ تھا۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت پیغام کی تھی نہ کہ حسن بیان کی۔ میری رائے میں جس وقت قوم خواب خرگوش میں محو تھی اس وقت علامہ اقبال کرب آگہی سے دوچار تھے۔ انہوں نے قوم کی نجات کا راستہ تلاش کرنے کے لیے بار بار قرآن پاک کی طرف رجوع کیا۔ جتنا انہوں نے قرآنی آیات پر غور و خوض کیا اتنا ہی یہ خیال ان کے دل میں راسخ ہوتا چلا گیا کہ قرآنی تعلیمات پر قرآن کی حقیقی روح کے مطابق عمل کئے بغیر مسلمانان عالم کی زبوں حالی ختم نہیں کی جا سکتی۔ ادھر قوم تھی کہ جھنجھوڑنے پر بھی خواب غفلت سے بیدار ہونے پر تیار نہ تھی۔ یہ خیال علامہ اقبال کے لیے سوہان روح تھا کہ وہ قوم جو قدرت کا بازوئے شمشیر زن بننے کی اہل ہے

محض اپنی بے حسی، غفلت، آرام کوشی، سہل انگاری اور بے عملی کی وجہ سے ذلت و رسوائی سے دوچار ہے اور غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کرب میں مزید اضافہ اس حقیقت کے ادراک سے ہوا کہ اس الم ناک صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک نسخہ کیمیا بھی دستیاب ہے لیکن احساس زیاں سے عاری قوم اس اکسیر کو آزمانے پر آمادہ ہی نہیں ہو رہی۔ ان حقائق کے پیشِ نظر اسی قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ جھنجھلاہٹ اور ہیجان کی کیفیت سے بھی گزرے۔

بایں ہمہ ایک عارف اور صاحب بصیرت رہنما کی حیثیت سے انہوں نے کسی بھی مرحلے پر نہ تو امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑا اور نہ ہی مایوسی کو خود پر غالب آنے دیا۔ البتہ وہ ابدی سوز دروں میں ضرور مبتلا ہو گئے۔ رب کریم نے قرآن مجید میں اللہ کے رنگ میں رنگے جانے کی جو دعوت دی ہے اس کی روح کو ان دشوار گزار وادیوں سے گزرنے کے بعد ہی پایا جا سکتا ہے ؎

یہ مرتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

ان کٹھن مراحل سے گزرتے ہوئے بھی وہ مستقلاً قرآن کریم سے ہی رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ سوز و گداز کی ان منازل کو طے کرنے کے بعد محبوب ہی کی خصوصیات محبّ میں جلوہ فگن نظر آنے لگتی ہیں اور جس طرح بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے ویسے بندۂ مومن کی زبان اللہ کی زبان بن کر دعوت الی الحق دینے لگتی ہے۔ اس ضمن میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علامہ اقبال نے قرآنی آیات کے ترجمے کی شعوری کوشش ہرگز نہیں کی بلکہ انہوں نے قرآنی تعلیمات کو اس طرح حرز جان بنا لیا تھا کہ آیات کا مفہوم خود بخود شعری قالب میں ڈھل کر ان کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گیا۔ ایسے تراجم کی تین طرح سے درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ پہلے درجے میں وہ اشعار آتے ہیں جو قرآنی آیات کا ہو بہو ترجمہ ہیں مثلاً قرآن مجید کی سورۂ فتح آیت نمبر ۲۹ میں ارشاد ہے۔

قرآن:

ترجمہ: یعنی وہ کفار کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں آپس میں پیار و محبت سے رہتے ہیں۔

اس موضوع پر اقبال کا شعر شاید آپ کے ذہن میں آ گیا ہو۔ فرماتے ہیں ؎

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اسی موضوع پر علامہ اقبال کا دوسرا شعر ہے ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

دوسرے درجے میں وہ اشعار ہیں جن میں الفاظ تو قرآنی آیات سے سو فیصد مطابقت نہیں رکھتے لیکن آیت کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے اور توجہ متذکرہ آیت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۶۰ ملاحظہ کیجیے۔

آیت:

ترجمہ: جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ پتھر پر اپنی لاٹھی مارو اور (جب انہوں نے ایسا کیا) تو پھر اس میں سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔

اسی آیت سے متاثر ہو کر علامہ نے وہ شعر کہا جو ضربِ کلیم کے متن میں تو شامل نہیں لیکن سرِ ورق پر مرقوم ہے ؎

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

تیسرے درجے میں وہ اشعار ہیں جن کا بظاہر کسی قرآنی آیت سے تعلق دکھائی نہیں دیتا لیکن در حقیقت وہ کسی نہ کسی قرآنی حکم یا تعلیم پر ہی مبنی ہوتے ہیں مثلاً ؎

تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بیقرار کرتا تجھے غمزۂ ستارا

یہ شعر ان قرآنی آیات پر مبنی ہے جن میں انسان کو فضاؤں، خلاؤں، ستاروں، چاند، سورج، زمین اور آسمان کی تخلیق پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آیئے اب اقبال کے اشعار کے حوالے سے ان تینوں درجوں میں آنے والے متفرق اشعار کا قرآنی آیات کے حوالے سے جائزہ لیں۔

ملاحظہ کیجیے سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۳۸ جس میں ارشاد ہے۔

قرآن:

میں پہلے ترجمہ پڑھ دوں آیت کا ''ہم نے خدا کا رنگ اختیار کر لیا ہے اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے؟'' علامہ صاحب دیکھیے کس خوبصورتی سے یہ پیغام آپ تک پہنچاتے ہیں۔

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دِہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دِہ

یعنی اپنے دِل کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے اور عمل سے اپنے عشق کی عزت و وقار میں اضافہ کر لے۔

سورۃ انفال کی آیت نمبر ۱۷ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

قرآن:

اس آیت کا ترجمہ ہے کہ: تم نے ان کفار کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا اور (اے محمد ﷺ) جس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔

اس آیت میں غزوۂ بدر کی جانب اشارہ ہے جب حضور ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں کفار کی جانب پھینکی

تھیں تو لشکرِ کفار کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کی آنکھوں، چہروں اور نتھنوں تک ان کا اثر نہ پہنچا ہو۔

علامہ اقبال نے اس آیت کو شعری جامعہ یوں پہنایا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

دنیا کی مال و دولت اور اولاد کی نعمت کے موضوع پر دو آیات ملاحظہ کیجیے۔

قرآن:

(۱۸:۴۶)

ترجمہ: مال و دولت اور اولاد تو صرف دنیاوی زندگی کی زیب و زینت ہیں باقی رہنے والے صرف نیک اعمال ہیں۔

قرآن:

(۳:۱۵۷)

ترجمہ: لوگ جو مال و دولت جمع کرتے ہیں اس سے خدا کی بخشش و رحمت کہیں بہتر ہے۔

اب دیکھئے کہ علامہ نے کس خوبصورتی سے ان دونوں آیات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا اِلٰہَ اِلّا اللہ

پھر ہم دیکھتے ہیں سورۃ محمد آیت نمبر ۲۴ جس میں انسان کو قرآن میں غور کرنے کی دعوت یوں دی گئی ہے۔

قرآن:

ترجمہ: بھلا یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟

علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

پھر سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۴۰ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قرآن:

ترجمہ: حکمرانی کا حق صرف اللہ کو ہے۔

اقبال فرماتے ہیں ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری

دانائی اور حکمت کے موضوع پر ارشادِ خداوندی ہے۔
قرآن:

(۲:۲۶۹)

ترجمہ: جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل مند ہیں۔

اور علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

یعنی اللہ تعالیٰ نے دانائی کو خیر کثیر کہا، جہاں کہیں اس (حکمت کی نعمت) کو پاؤ حاصل کرلو۔
قرآن کریم کی سورۃ ذرا یٰت آیت نمبر ۲۱ میں اللہ تعالیٰ استفسار کرتے ہیں۔
آیت:

ترجمہ: یعنی تم اپنے نفسوں کے اندر کیوں نہیں دیکھتے؟
علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

قرآن مجید کی سورۃ طور آیت نمبر ۲۱ میں اللہ تعالیٰ نے اعمال کی اہمیت یوں بیان کی ہے۔
آیت:

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ
ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے رہن (گروی) ہے یعنی اچھے اعمال پیش کرنے سے ہی گروی شخص کو رہائی مل سکتی ہے۔
علامہ صاحب کے اس موضوع پر متعدد اشعار ہیں۔ میں ایک پڑھ دیتا ہوں ؎

یہ گھڑی محشر کی ہی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

سورۃ شوریٰ آیت نمبر ۳۰ میں انسان کے اعمال اور مصائب کا رشتہ یوں واضح کیا گیا ہے۔
آیت:

ترجمہ: جو مصیبت تمہارے اوپر آتی ہے تمہارے اعمال سے آتی ہے یعنی انسان اپنے اعمال کی جو

فصل بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔

اقبال اس موضوع پر فرماتے ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

منافقوں اور بے عمل عالموں کے متعلق سورۃ صف آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہے۔

قرآن:

ترجمہ: تم جو بات کرتے نہیں ہو اسے کہتے کیوں ہو؟

اقبال ان بے عمل عالموں کے ضمن میں فرماتے ہیں ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اقبال کا تصورِ خودی

آج کی نشست سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اقبال کے فلسفہ خودی پر بھی تھوڑا سا اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ مستشرقین نے خودی سے مراد EGO یا انانیت لیا ہے۔ Jhon T.Platt اور Dr. S.W Fallon نے اردو انگریزی ڈکشنری میں خودی کے لیے چار انگریزی حروف استعمال کیے ہیں۔ Egotism یعنی انانیت، Arrogance یعنی ہٹ دھرمی، Self Conceit & Paronoia یعنی اپنی عظمت اور بڑائی کے متعلق بلا جواز زعم۔ میری عاجزانہ رائے کہ علامہ اقبال نے خودی کی اصطلاح جن معنوں میں استعمال کی ہے اُس سے مراد عرفانِ ذات یا خودِ آگہی ہے یعنی (Self Recognition) اور وہ چار عناصر کا مرکب ہے یعنی:۔

Self Confidence
Self Reliance
Self Respect
&
Unflinching Faith in Allah's Benevolence and one's own Capabilities

(یعنی ۱۔خود اعتمادی یا اعتمادِ ذات ۲۔خود انحصاری ۳۔عزت نفس ۴۔اللہ کی رحمت پر غیر متزلزل ایمان اور اپنی صلاحیتوں پر کامل یقین)

اپنے اس خیال کو تقویت دینے کے لیے میں ایک بار پھر وہ شعر پڑھتا ہوں۔

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یعنی جب موسیٰؑ نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنا عصا پتھر پر مارا تو سدِ راہ بننے والے پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے۔

اعتماد ذات

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

مسئلہ جبر و قدر (تقدیرِ مبرم و معلق)

عبث ہے شکوہ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند
ستارہ میرے مقدر کی کیا خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

کلامِ اقبال کے اس موضوعی جائزے سے علامہ اقبال کے کلام کے مقصدیت کے متعلق کوئی شکوک وشبہات باقی نہیں رہتے۔ مجھے اس حقیقت کا شدت سے احساس ہے کہ کلام اقبال کا اتنا مختصر جائزہ ان کے ابدی پیغام سے ناانصافی کے مترادف ہے۔ تاہم آج کے اس نفسانفسی اور مادیت سے بھرپور ماحول میں اگر ہمیں اس زندہ جاوید فلسفی کے کلام پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کی فرصت بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔ اس سے پیشتر کہ آپ میرے متعلق بھی یہ رائے قائم کرلیں کہ

گفتار کا یہ غازی تو بنا
کردار کا غازی بن نہ سکا

میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔

حواشی

۱۔ ۲/اکتوبر ۲۰۰۲ء کو ایوانِ کارکنانِ پاکستان کے زیر اہتمام مجلس مذاکرہ میں صدارتی خطبہ دیا گیا۔